ابنِ انشا

پیدائش: ۱۹۲۷ء

وفات: ۱۹۷۸ء

ابنِ انشا کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔ وہ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور چلے آئے۔ ادبی زندگی کا آغاز بحیثیت شاعر کیا۔ بعد میں بطور مزاح نگار، افسانہ نویس، صحافی اور سفرنامہ نویس شہرت حاصل کی۔ مزاح کے میدان میں انھوں نے اپنی خُداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور ہر طرح کے قاری سے داد وصول کی۔ ان کا اسلوبِ تحریر سادہ، رواں، دلکش اور شگفتہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں مزاح پیدا کرنا اُن کا خاصہ ہے۔ ہر موقع پر ہنسنے ہنسانے کی گنجائش پیدا کر لیتے ہیں۔ الفاظ کے صحیح انتخاب اور اُن کے درست استعمال پر اُنھیں قدرت حاصل ہے۔ چلتے ہو تو چین کو چلیے، دُنیا گول ہے، ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں، اور آوارہ گرد کی ڈائری میں ابنِ انشا ایک ایسے بنجارے کے روپ میں نظر آتے ہیں، جو گرد و پیش پر بیگانہ روی سے نظر ڈالتے ہیں، لیکن حقیقت میں اُن کی آنکھ اشیا کے باطن کو دیکھتی ہے اور قاری کو ماضی اور حال سے آشنا کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے قاری کی دلچسپی کے لیے معلوماتی مواد اور تاریخی واقعات کو موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں طنزِ لطیف پایا جاتا ہے، جس سے بات میں عمق اور اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بھولے بسرے اور متروک الفاظ کے استعمال سے منفرد دلکشی پیدا کی ہے۔

تصانیف: [illegible] آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے، ابنِ بطوطہ کے [illegible] اس بستی کے اک کوچے میں وغیرہ۔

شیراز اور کنارِ آبِ رُکنا باد وغیرہ

ان لوگوں پر ہمیں رشک تو خیر کبھی نہیں آیا؛ تعجب ہمیشہ ہوا ہے، جو صبح اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ چرند پرند کی اور بات ہے، انسانوں کا اتنے سویرے اٹھنا کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لحاف کے اندر جو مزے کی غنودگی ہوتی ہے، اِس کا لطف صبح اٹھنے والے بے نصیب کیا جانیں۔ وہ تو اس وقت جنگل میں داتنیں کاٹ رہے ہوتے ہیں یا ٹھرٹھر کرتے لارنس باغ کے چکر۔ صبح اٹھنے کے فضائل ہم نے بھی پڑھے ہیں لیکن صبح خیزوں میں سے کچھ کو تو نمونیے یا بگڑے زکام سے مرتے دیکھا، باقی کی عمریں بھی ہماری چال کے ست الوجودوں سے زیادہ لمبی ہوتی نہیں دیکھیں۔

پس ہم نے رات ہی کو ہوٹل کے نوکروں کو وصیت کر دی کہ بھائی صبح پانچ بجے جگا دینا، ہم شیراز جائیں گے۔ سبھی نے "چشم" کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھے اور واقعی سب کے سب علی الصبح ہمارے دروازے کے سامنے صف بستہ کھڑے تھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو ابھی کالی رات تھی حتیٰ کہ مرغ بھی جن کو بانگ دینے کے لیے اُٹھنا چاہیے تھا، خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ لمبی سی آہ بھر کر اُٹھے۔

شیراز کا ہوائی اڈہ بس ننھا منا سا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیراز کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی اس کی قدامت وعظمت کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ موسم خزاں کا تھا، نہ پھول نہ پات۔ یہ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ شہر ہے جس کے گل و گلزار کی تعریف سبھی کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ امریکن ٹورسٹ بھی تھے۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو یہاں کیا ملتا ہے، نہ زبان سے علاقہ، نہ ادب وتہذیب سے نسبت۔ ایک کیمرہ لٹکایا، میم کو ساتھ لیا، جہاں کی تعریف سنی اُدھر سدھار لیے۔ ہمارے ساتھ سامان کا کھڑاک نہ تھا۔ بس سواری کی تلاش تھی۔ ساتھ ہی میکڈویل ایجنسی تھی۔ شیراز اور اصفہان میں (اور جگہ بھی ہوگا) یہی ایجنسی ٹورسٹ بیورو کا کام بھی کرتی ہے

Not For Sale

اور ہوا پیمائی ایران کے ٹکٹ دینے کا بھی۔ ان سے ہوٹل کی بات کرتے کرتے معلوم ہوا کہ اگر شب بھر قیام کرنے کی بجائے ابھی سے ٹیکسی لے کر آغاز کر دیں تو تمام مقام دیکھے جاسکتے ہیں۔ مسجدِ وکیل وحافظ وسعدی کے مزار، دروازۂ قرآن وغیرہ تو شہر ہی میں ہیں۔ میوزیم بند ہے۔ سوال فقط تختِ جمشید کا رہ جاتا ہے جو ساٹھ ستر میل کی مسافت ہے۔ میکڈویل ایجنسی والوں نے کرائے کا لمبا چوڑا حساب بتایا جو امریکنوں کے حساب سے ٹھیک ہی ہوگا۔ پھر وہ اصرار کر رہے تھے کہ پہلے تختِ جمشید جاؤ۔ شہر میں کیا دھرا ہے۔ اِدھر اپنا دل تھا کہ حافظ اور سعدی میں اٹکا تھا لہٰذا ہم نے ٹیکسی لی اور سیدھے مزارِ حافظ کا راستہ لیا کہ وہی پہلے پڑتا تھا۔ حافظ کے احاطے میں دیکھا کہ جابجا لوگوں کی ٹولیاں بیٹھی ہیں اور ایک کونے میں کوئی شخص ٹیپ ریکارڈ لیے کوئی پروگرام ریکارڈ کر رہا ہے۔ اونچی کرسی پر مزار ہے لیکن مزار کے گرد کوئی جالی یا پردہ نہیں کہ اندر اطمینان سے بیٹھ کے کوئی فاتحہ پڑھ سکے۔ کہتے ہیں: یہاں فال کے لیے دیوان کا ایک نسخہ رکھا رہتا ہے، ہمیں نظر نہ آیا۔ لڑکے لڑکیاں تفریح کے موڈ میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے دور ہی سے فاتحہ پڑھی اور ٹیکسی والے سے کہا: چلو! اب سعدی کے مقبرے۔

مزارِ شیخ کے احاطے کے پھاٹک پر ہی یہ شعر رقم تھا:

ز خاکِ سعدیِ شیراز بوئے عشق آید
ہزار سال پس از مرگِ او اگر بویم

احاطے کے اندر داخل ہوتے ہی طبیعت ایک عجیب سرور سے آشنا ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ ذرّہ ذرّہ دامن کشاں ہے۔ مقبرہ نہایت سادہ ہے اور ایک کاریڈور کے سرے پر بہت مختصر سا گنبد ہے جس کے چار طرف جالیاں، اندر مزار ہے۔ بہت سی عورتیں مزار کو بوسہ دے رہی تھیں۔ معلوم ہوا منتیں بھی مانی جاتی ہیں۔ ایک طرف خدمت گار کھڑا تھا اور کسی عقیدت مند خوشنویس کی لکھی ہوئی گلستان کی ایک حکایت اور بوستان کی ایک نظم دیوار پر آویزاں تھی۔ جب مزار سے عورتیں رخصت ہو گئیں، ہم فاتحہ کے لیے بڑھے۔ لیکن جانے کیا ہوا؟ معاً جی بھر آیا اور ہم نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔ جتنا ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے، سیلاب اور اُمڈتا تھا۔ فاتحہ بہت طویل ہو گئی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ محافظ ہماری یہ کیفیت

دیکھے۔ جانے کتنے عالم آنکھوں کے آگے آئے۔ وہ دن جب ہم نے اپنے گاؤں میں گلستان کے درس کا آغاز کیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ: ''در بابِ شاہاں'' سے ہمارا درس شروع ہوا تھا اور ''زندیست نام فرخ نوشیرواں'' والی حکایت پہلی تھی۔ پھر ''قافلۂ وزدان برسرِ کوہے نشستہ بودند'' یاد آئی۔ ہم نے سعدی کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دوست سمجھا اور شاید یہ داخلی رفاقت اور دوستی تھی جس سے یہ حال ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا: یہی نواح ہوں گے، جن میں ہمارا شیخ سیر کرتا تھا، گھومتا پھرتا تھا اور پھر لوگ یہاں اس کا جنازہ لائے ہوں گے۔ یہ وہی سعدی ہے، یہ وہی شیراز ہے۔ یعنی وہی پہنائی ہے جس سے بچپن سے غائبانہ آشنائی ہے۔ یقین نہ آتا تھا۔

شیخ کے مزار سے رخصت ہونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُٹھتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ حافظ کے مزار پر قطعاً یہ کیفیت نہ تھی۔ وہاں ہم خالی گئے، خالی آئے۔

یادگار کے لیے ہم نے کیاریوں پر نظر ڈالی۔ صاحبِ گلستان کے چمن میں گلاب کا کوئی پھول اس وقت نظر نہ آیا۔ ناچار گلِ صد برگ کا ایک غنچۂ نوشگفتہ لیا اور جیب میں رکھ لیا۔ شیخ کی یہ یادگار ایک متاعِ عزیز کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

اگلی منزل تھی............................ مسجدِ وکیل

نادر شاہ کے قتل کے بعد شیراز میں کریم خان زند کی حکومت رہی جو اپنی نیک نفسی اور رعایا دوستی کے لیے مشہور تھا۔ اس نے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے سے انکار کیا تھا اور خود کو وکیل الرعایا ہی کہا۔ اس کے عہد میں شیراز کے بھاگ کھلے اور یہ مسجد بھی اس کی یادگار ہے جس کی ٹائیلیں بہت خوبصورت ہیں۔ ساتھ ہی مشہور بازارِ وکیل ہے۔

وہاں سے ٹیکسی لی اور دروازۂ قرآن دیکھا۔ ایک زمانے میں شیراز کے گرد فصیل اور دروازے تھے جن میں فقط یہی باقی ہے۔ اس کا نام قرآن دروازہ اس لیے ہے کہ اس کے اوپر برکت کے لیے قرآنِ مجید کا ایک نُسخہ رکھا رہتا تھا جو اب تہران کے عجائب گھر میں ہے۔ اصفہان اور تختِ جمشید سے آنے والی شاہراہ اسی دروازے کے نیچے سے گزرتی ہے۔

ابھی شاید بارہ کا عمل تھا اور تختِ جمشید بند تھا۔ ہم نے ایک سالم ٹیکسی روکی۔ اس نے پندرہ تومان کہے، ہم نے دس۔ آخر بارہ طے ہو گئے۔ ڈرائیور کا نام منصور تھا اور اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے تھوڑی انگریزی بھی آتی ہے۔ یہ دعویٰ اس کے ہمنام منصور کے دعویٰ انا الحق سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز تھا، کیونکہ اصل میں اسے صرف ایک لفظ آتا تھا: Yes اور اسے وہ مسلسل اور متواتر استعمال کرنے پر مصر تھا۔ ہم فارسی میں لمبی چوڑی گفتگو کرتے تھے اور وہ Yes کہہ کر فارغ ہو جاتا تھا۔ گفتگو کم و بیش یوں رہی تھی۔

سوال: (فارسی میں) میاں منصور! تم شیراز کے رہنے والے ہو یا باہر کے۔

جواب: Yes

سوال: یہاں سے اصفہان کے کوس پر ہے؟

جواب: Yes

سوال: ہمارا جہاز ساڑھے تین بجے روانہ ہوتا ہے یا چار بجے۔

جواب: Yes

آخر ہم نے نہایت عاجزی سے کہا کہ ہم انگریزی نہیں سمجھتے، فارسی میں گفتگو کرو۔

بہرحال انگریزی کیسی بھی ہو، ٹیکسی منصور کی اچھی تھی اور خوب چلتی تھی۔ راستے میں ہم نے پوچھا: افسوس! رُکنا باد نہیں دیکھا۔ اس وقت ہم ایک نالے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ منصور نے کہا: آقا! یہی رُکنا باد ہے۔ یہ ایک سوکھا نالا تھا۔ حافظ صاحب یہیں سیر کر کے خوش ہو جاتے ہوں گے۔ منصور نے کہا: بہار کے موسم میں آیئے اور سبزے کی بہار دیکھیے۔ یہ موسم شیراز دیکھنے کا نہیں ہے۔ گھاٹیاں آتی تھیں، گزر جاتی تھیں۔ آخر پچپن ساٹھ میل جانے کے بعد افق پر دارا کے محل کے میناروں کی تحریر نظر آئی۔ آخر آ گیا نا تختِ جمشید۔

ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور دھوپ خاصی تیز ہو گئی ہے۔ دارائے اعظم کا شہر عذار سامنے ہے۔ حدِ نظر تک محلوں کے خرابے اور ستونوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے یہیں تیسرے دارا اور اسکندرِ اعظم کی فوجوں کا ... ہوا تھا اور ... جگہ ... رہا تھا جہاں اب ہیپی کولا کا سٹال ہے۔ ہیپی

کولا تو ایک طرف اس وقت اس غریب کے منہ میں کوئی پانی چوانے والا بھی نہ تھا۔ یہ جو امریکی ایمبولینس یہاں کھڑی ہے، بہت بعد میں پہنچی اور شیراز کا مشہور نمازی ہسپتال بھی کوئی ڈھائی ہزار سال دیر سے بنا۔

دارا سے بھی ہماری ملاقات پرانی ہے۔ اس زمانے میں ہم سکول کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ اسکندرِ اعظم کے ہاتھوں دارا کی شکست اور تباہی کا حال پڑھ کر چنداں افسوس نہ ہوا تھا کیونکہ اسکندرِ اعظم کو ہم مسلمان سمجھتے تھے...... اسکندرِ اعظم پر ہی کیا موقوف ہے، جتنے ناموں میں ف، ق، غ، ظ وغیرہ آئیں، وہ ہندو تو بہرحال نہیں ہو سکتے تھے مثلاً: فیلقوس، ارسطو، افلاطون، فیثا غورث، سقراط، بقراط اور ان دنوں ہمارے نزدیک قومیں فقط دو تھیں: ہندو اور مسلمان۔ افسوس ہوتا تھا کہ اسکندر دریائے بیاس کے مغربی کنارے سے کیوں لوٹ گیا۔ ہمارا گاؤں بیاس کے مشرق میں کوئی زیادہ دور تھوڑی تھا۔ ''اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما۔''

یہ جو چٹانوں کا سلسلہ تختِ جمشید کے پس منظر میں نظر آتا ہے، کوہِ رحمت کہلاتا ہے۔ تختِ جمشید کو جمشید کیوں کہتے ہیں؟ کوہِ رحمت میں رحمت کی کیا بات ہے اور وہ جو ہم نقشِ رُستم دیکھنے جائیں گے اس سے رُستم کا کیا تعلق ہے؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہیں کہیں تختِ جمشید سے سو سال پہلے سیروسِ اعظم کا بنا کردہ شہر پازرگاد تھا اور انھی نواحات میں اصطخر کی آبادی تھی۔ اصطخر تو عہدِ اسلام میں کئی صدیوں تک مشہور رہا۔ اب یہ تینوں شہر محض خرابے ہیں۔

[illegible]

کھنڈرات کی کرسی زمین سے کوئی تیس چالیس فٹ اونچی ہے اور اس پر چڑھنے کے لیے چوڑی سیڑھیوں کا سلسلہ ہے۔ ان سیڑھیوں پر گھوڑے مع سواروں کے ٹاپیں مارتے چڑھتے تھے۔ لیجیے! اب مسطح میدان ہے۔ بہت سے محلوں میں تو میناروں کے فقط ٹھنٹھ باقی ہیں لیکن بعض منارے اب بھی آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ دیواریں کئی کئی فٹ تک قائم ہیں اور دروازے تو اکثر جگہ ڈھائی ہزار سال سے یونہی کھڑے ہیں اور ان کی نقاشیوں کا جلال قائم ہے۔ کہیں شیروں کے مجسمے ہیں، کہیں بیلوں کے بت۔ یہاں حمام تھا۔ یہاں دیوانِ خاص تھا۔ اب آپ دھوپ کی پروا نہ کرتے ہوئے چلتے چلیے، محلوں کی وسعت سے نہ

گھبرائیے۔ آخر بنانے والے اپنے زمانے کے جہاں پناہ تھے۔ اس زمانے میں آپ کو کون یہاں گھسنے دیتا۔ وہ تو وہ، ان سیاحوں کی ہڈیاں بھی گل گئیں جنھوں نے اپنے ناموں کو دوام عطا کرنے کے لیے انھیں مختلف دروازوں اور محرابوں پر ٹھیکریوں سے کندہ کردیا ہے۔ کوئی کتبہ جرمن میں ہے، کوئی فرنچ میں۔ ایک ۱۸۹۶ء کا ہے نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار کا۔ ایک کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے، ایک ۱۸۳۶ء کا بھی۔ صحنوں، صحنچوں، ایوانوں میں سے گزرتے ہوئے ایک میوزیم میں پہنچتے ہیں۔ چھوٹا سا میوزیم ہے کیونکہ یہاں کے آثار کچھ تہران چلے گئے، کچھ اپنے آبا کی کتابوں کی طرح لندن اور پیرس میں۔ تختِ جمشید کے میوزیم میں زیادہ تر چھوٹے بڑے مٹکے منکیاں ہیں، جلی ہوئی لکڑی کے کچھ ٹکڑے بھی، کیونکہ آخر سارا محل آگ کے سپرد کردیا گیا تھا۔

تختِ جمشید میں سب سے رفیع الشان محل تو دارا کا ہے۔ دوسرے نمبر پر اس کے جانشین خرخشاس اوّل کا صدستوں محل اس کا نام ''اپادانا'' ہے جس کو داریوش (دارا) اوّل نے شروع کیا اور اس کے بیٹے نے مکمل کیا۔ یاد رہے کہ اسکندر سے لڑتے ہوئے جو شہنشاہ مارا گیا، وہ دارا نام کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اسی طرح کئی بہرام ہوئے ہیں اور کئی خرخشاس۔ اپاداما کے تیرہ ستون ابھی باقی ہیں اور محل کے مشرقی زینے پر شاہِ معظّم کی خدمت میں ۲۸ قوموں کے لوگوں کو نذریں لاتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے پہلو میں دارا کا پرائیوٹ محل ہے جو ''تکارا'' کہلاتا ہے اور اس کے دروازے پر شاہ کے ایک عفریت سے لڑنے اور اس کے سر میں تلوار بھونکنے کی تصویر مرتسم ہے۔ بادشاہ کی ڈاڑھی اور کپڑوں میں جواہر نکے تھے، اب فقط سوراخ باقی ہیں۔ اس طرح ایک نجی محل خرخشاس اول کا بھی۔ پھر ایک ملکہ کا محل، جس میں خدام اور لونڈیوں کے لیے حجرے ہیں۔ جو عمارت میوزیم کی ہے وہ پہلے استقبال گاہ تھی۔

نقشِ رستم، تختِ جمشید سے چار چھے میل آگے ہے۔ ہم نے جی میں سوچ لیا تھا کہ وہاں جانے کے دو چار تومان ڈرائیور کو اور دے دیں گے۔ ہم نے کہا: میاں منصور! چلو نقشِ رستم کے نقوش تو سڑک پر ہی سے نظر آجاتے ہیں، باقی رہے دیوار میں بنے ہوئے حجروں میں تابوت، ان کے دیکھنے مین پانچ دس منٹ لگیں گے۔ ان حجروں کے دہانے سڑک سے کوئی سوفٹ سے زیادہ اونچائی پر ہوں گے۔ پرانی تحریروں کے

مطابق وہاں تک رسوں سے چڑھتے تھے۔ تابوت بھی یونہی کھینچے گئے تھے۔ اب ایک تنگ گول زینہ لوہے کا لگا دیا گیا ہے۔ ان مقبروں اور تابوتوں کا حصہ بہت تنگ و تاریک ہے۔ پہاڑ کو اندر سے کھود کر بنایا گیا ہے۔ باہر سڑک کے رُخ کی تصویریں اور کتبے ساسانی بادشاہ اردشیر کے ہیں، یعنی تیسری صدی عیسوی کے۔ ایک جگہ بہرام دربار لگائے ہوئے ہے۔ ان تابوتوں میں ایک تو دارایوش اوّل کا بیان کیا جاتا ہے، دوسرے کے متعلق قیاسات اور اختلافات ہیں۔

لیجیے صاحب! جو شہر صدیوں میں بسے اور اسکندر کو آکر ڈھانے پڑے، ہم نے ڈھائی گھنٹے میں دیکھ لیے۔ اب پھر ہم تھے اور شیراز کی سڑک، جس پر منصور کی ٹیکسی ساٹھ میل کی رفتار سے فراٹے بھرتی جارہی تھی۔ ہم نے اپنے جی ہی جی میں حساب جوڑا، بارہ تومان تختِ جمشید تک اور جیسا کہ رستے میں طے ہوگیا تھا۔ دس تومان واپسی کے، کل ۲۲۔ نقشِ رستم تک جانے کے دو تین چار پانچ سمجھ لیجیے۔ شہر سے ہوائی اڈا دور نہیں۔ دو تین اس کے بھی، گویا تیس تومان۔ چلیے! منصور بھی خوش ہوجائے گا، لیکن:

• من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال

تختِ جمشید سے واپسی پر شیراز کی سڑک پر فراٹے بھرتے ہوئے حافظ و سعدی کے ذکرِ لطیف میں بات سے بات نکالتے ہوئے منصور نے کہا: ''آپ مجھے کتنے پیسے دیں گے؟''

ہم نے کہا: ''برادر بجان برابر! کوئی بے اعتباری ہے کیا؟ تمھیں خوش کردیں گے۔''

بولے: ''نہیں! یہ بات نہیں، یہ ٹیکسی ہی آپ کی ہے۔ آئندہ جب کبھی جنابِ عالی شیراز تشریف لائیں تو اس خانہ زاد منصور کو یاد رکھیں۔ اس ناچیز کے ہوتے کسی اور سے آپ خدمت لیں گے تو میرا دل توڑیں گے۔''

ہم نے کہا: ''واہ! یہ کبھی ہوسکتا ہے؟''

ائیرپورٹ پر پہنچ کر ہم نے بائیس یا پچیس کی بجائے جو ان کا حق ہوتا تھا، تیس تومان منصور صاحب کی مٹھی میں دے دیے۔

بولے: ''یہ کیا؟ یہ تیس ہیں، اتنے تو میں نہیں لوں گا۔''

• میں کس خیال میں ہوں اور آسمان کس خیال میں ہے۔

ہم نے کہا: ''لے لو، لے لو، ہم کوئی بطور بخشش یا انعام تھوڑا ہی زیادہ دے رہے ہیں، ان پانچ تومان کو ہمارا دوستانہ نذرانہ سمجھ کر قبول کرو۔ تکلف نہیں کیا کرتے۔''

لیکن منصور صاحب ناک بھوں چڑھا کر بولے: ''جناب! پینتیس سے ایک تومان کم نہ لوں گا۔''

''پینتیس؟ وہ کیسے؟'' ہم نے پوچھا۔ ''۱۲+۱۰ تو ۲۲ بنے، تھوڑا اوپر لگالو۔ ۲۵ ہوگئے چلو! ۲ اور سہی، لیکن ۳۵ کیسے؟''

بہت سی فارسی بول کر فرمایا: ''حساب کو چھوڑیے پینتیس ہی ہوتے ہیں''۔ ہم ٹیکسی سے نکل چکے تھے لیکن وہ بھلا مانس جو تھوڑی دیر پہلے تک خانہ زاد بنتا تھا، رستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ ''جناب! پینتیس دیجیے پینتیس۔''

اب ہوائی اڈے کے حمال اور دوسرے بے فکرے تماشائی آن جمع ہوئے۔ ان سے فریاد یا استغاثہ کیا کرتے۔ منصور ہم سے اچھی اور تیز فارسی بولتا تھا۔ ممکن ہے ہم مقدمہ جیت بھی جاتے، لیکن اصفہان کا جہاز ضرور چھوٹ جاتا۔

پس ہم نے کہا: ''لو میاں! ۳۵ تومان۔ قربانت شوم! تم تو کہتے تھے، ٹیکسی آپ کی ہے۔''
منصور نے نہ ہمارے سلام کا جواب دیا نہ کوئی اور بات کی۔ ٹیکسی لے یہ جا وہ جا۔

(ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔

(ا) مصنف سحر خیزی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

(ب) حافظ کے مزار پر ان کے دیوان کا نسخہ کیوں رکھا جاتا تھا؟

(ج) شیخ سعدی کے مزار پر مصنف کی کیا کیفیت ہوئی؟

(د) ڈرائیور منصور کی انگریزی کے بارے میں مصنف نے کیا مثال پیش کی؟

(ہ) دارا اور سکندر کون تھے؟

(و) ڈرائیور منصور اور مصنف کے درمیان کرائے کا کیا معاملہ پیش آیا؟

۲۔ درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(ا) نہ زبان سے علاقہ، نہ ادب و تہذیب سے نسبت، ایک کیمرہ لٹکایا، میم کو ساتھ لیا، جہاں کی تعریف سنی اُدھر سدھارے۔

(ب) ہم نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے، تو آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا، جتنا ضبط کی کوشش کرتے تھے، سیلاب اور امڈتا تھا۔

(ج) ان سے فریاد یا استغاثہ کیا کرتے؟ منصور ہم سے اچھی اور تیز فارسی بولتا تھا، ممکن ہے ہم مقدمہ جیت بھی جاتے لیکن اصفہان کا جہاز ضرور چھوٹ جاتا۔

(د) یہاں کے آثار کچھ تہران چلے گئے، کچھ اپنے آبا کی کتابوں کی طرح لندن اور پیرس میں۔

(ہ) اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے تھوڑی انگریزی بھی آتی ہے۔ یہ دعویٰ، اس کے ہم نام منصور کے دعوے انا الحق سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز تھا۔

۳۔ امدادی فعل کی تعریف کریں اور مثالیں دیں۔

۴۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ مفہوم واضح ہوجائے۔
قدامت و عظمت، غنودگی، دیوان خاص، رفیع الشان، عفریت، خانہ زاد، بھلا مانس۔

۵۔ سفرنامے کی تعریف کریں اور اس کے فنی لوازمات لکھیں۔